اپنی معلومات کی جانچ:

1. محمد تقی میر کب اور کہاں پیدا ہوئے؟
2. والد کے انتقال کے بعد میر آگرہ سے کہاں گئے اور کس نے ان کی سرپرستی کی؟
3. نادر شاہ کے حملے کے بعد وہ دہلی چھوڑ کر کہاں گئے؟ لکھنؤ میں ان کے سرپرست کون تھے؟

6.3 میر کی غزل گوئی

میر کی شاعری کو سمجھنے اور اس کا محاکمہ کرنے کے لیے ان کی گھریلو اور ذاتی زندگی اور پھر ان کے عہد کے تاریخی حالات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔ ان کی گھریلو زندگی افلاس اور بے سروسامانی میں گزری۔ ان کے منھ بولے چچا امان اللہ انھیں فقیری، داخلیت پسندی، تشتتِ خاطر اور خلوت پسندی کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ تصوف کی طرف مائل ہوئے۔ خارجی حالات انتشار اور افراتفری کی زد میں تھے۔ اورنگ زیب کی وفات (1707ء) کے بعد ملک سیاسی طور پر غیر یقینیت کا شکار ہوا۔ سماجی، تہذیبی اور علمی مشاغل انحطاط کی طرف مائل تھے۔ بیرونی حملوں نے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اندرونی بغاوتوں نے لوٹ مار اور خوں ریزی کا بازار گرم کیا تھا۔ میر ان ہوش ربا اور انتشار خیز حالات و واقعات سے گزرتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی شعری شخصیت ان سے گہرے طور پر متاثر ہوئی اور اس طرح یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے لیے یہ حالات ایک بنیادی شعری محرک بن گئے۔ مولوی عبدالحق نے لکھا ہے:

"میر نے حیرت انگیز اور زہرہ گداز واقعات اور انقلابات کو دیکھا اور برتا" (مقدمہ انتخابِ کلامِ میر)

مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے:

"میر کی شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ ان کے زمانے کے معاشرتی ماحول اور ان اسباب و حالات پر جن کے اندر رہ کر میر کی شخصیت کی تعمیر ہوئی، دقیق نگاہ ڈالی جائے۔" (میر اور ہم)

خواجہ احمد فاروقی کا خیال ہے کہ:

"میر کی زندگی اور شاعری کو اس سیاسی، معاشرتی اور نفسیاتی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔" (میر، حیات اور شاعری)

عام طور پر میر کی شاعری پر لکھتے ہوئے نقادوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ میر کی شاعری ان کے ذاتی دکھ درد اور ان کے عہد کے حالات کی ترجمانی کرتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر کی شاعری کے بارے میں یہ مروجہ خیالات میر کی شاعرانہ عظمت پر دلالت نہیں کرتے۔ میر ایک منفرد اور بڑے شاعر ہیں۔ ان کی عظمت اور انفرادیت کا اعتراف نہ صرف تذکرہ نگاروں نے کیا ہے بلکہ معاصر نقادوں میں مولوی عبدالحق، سید احتشام حسین، آل احمد سرور، اثر لکھنوی، فراق گورکھپوری، حسن عسکری، نظیر صدیقی، شبیہ الحسن، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمان فاروقی اور حامدی کاشمیری نے بھی کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے میر کی شاعرانہ عظمت کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

"میر صاحب کے کلام میں ایسے حیرت انگیز جلوے اکثر نظر آتے ہیں، جس طرح بعض اوقات سمندر کی سطح دیکھنے میں معمولی اور بے شور و شر نظر آتی ہے لیکن اس کے نیچے ہزاروں لہریں موجزن ہوتی اور ایک کھلبلی مچائے رکھتی ہیں، اسی طرح اگرچہ میر صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم، دھیمے، سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن ان کی تہہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے" (انتخابِ کلامِ میر)

مولوی عبدالحق نے میر صاحب کے کلام میں "حیرت انگیز جلوے" کا ذکر کر کے تاثراتی انداز میں سہی، میر شناسی میں ایک پتے کی بات کہی ہے۔ جدید تنقیدی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو میر کی شاعری کے حیرت انگیز جلوؤں" کا ذکر ان کے اشعار میں کثیرالمعنویت کی طرف اشارہ کرتا ہے خود میر اپنی شاعری کی اس خصوصیت سے آگاہ تھے، کہتے ہیں:

صد رنگ مری موج ہے میں طبع رواں ہوں

یہ دراصل ان کی شاعری کی "صد رنگی" ہے جو ان کی عظمت کے لیے راستہ کھولتی ہے اس سے فوری طور پر اس مفروضے کا ابطال ہوتا ہے کہ میر اپنے

عہد اور اپنی ذات کے ترجمان تھے۔ یہ خیال شاعری کو منظوم صحافت کی سطح پر لاتا ہے۔ میر ایک بلند پایہ تخلیق کار ہیں خارجی حالات و واقعات سے وہ
طور پر متاثر ضرور ہوئے لیکن وہ ان کی تخلیقی قوتوں کو جگانے کا سبب بن گئے۔ غالب بھی ایک پر آشوب دور میں لکھتے رہے۔ انھوں نے اپنے عہد میں مغلیہ سلطنت
کے زوال اور ملک کی تباہی و بربادی کے مناظر دیکھے لیکن ان کے اشعار سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کوئی شہر آشوب لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے خود اپنی شاعری
کے بارے میں کہا کہ وہ لاشعور سے ابھر کر آتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

''غیب'' سے ان کی مراد لاشعور ہی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک بڑا تخلیق کار اپنی زندگی یا عہد کے حالات کا اثر قبول تو کرتا ہے مگر یہاں کی تخلیقی قوت
بے حد متحرک ہوتی ہے اور پھر وہ اس کے موثر اظہار کے لیے لفظوں کی ترکیب سے کام لیتا ہے۔ میر کی شاعری میں یہی تخلیقی عمل کارفرما ہے۔ ان کے یہاں
تخیل کی کارگزاری اور عمل داری اتنی نمایاں ہے کہ انھیں دنیا کے بڑے شعرا میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ قسم کی شاعری میں جو مظاہر اشیا اور موجودات
ابھرتے ہیں وہ حقیقی صورت کو تج کر ایک نئی شکل اختیار کرتے ہیں۔ میر کی غزلوں میں بھی اشیا کی صورت بدل جاتی ہے۔ ذیل میں تین اشعار درج کیے
جاتے ہیں جن میں اشیا ایک نئی صورت میں نظر آتی ہیں:

1 خورشید و ماہ و گل سبھی ادھر رہے ہیں دیکھ
اس چہرے کا اک آئینہ حیران ہی نہیں

2 شام شب وصال ہوئی یاں کہ اس طرف
ہونے لگا طلوع ہی خورشید روسیاہ

3 لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہ شیشہ گری کا

پہلے شعر میں خورشید و ماہ و گل کے ساتھ ہی آئینہ دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دوسرے شعر میں خورشید کو روسیاہ دکھایا گیا ہے۔ تیسرے شعر میں
'آفاق' کارگہ شیشہ گری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بقول سید احتشام حسین :

''میر کی شاعری کا اصلی محور عشق ہے''

آیئے اب میر کی غزلوں میں ابھرنے والی شعری دنیا میں نمایاں واقعات کی نشان دہی کریں۔ اس دنیا میں ایک عشق پیشہ کردار ابھرتا ہے جو میر کی
حقیقی زندگی میں عشق کی ناکامی کی یاد دلاتا ہے۔ حقیقی زندگی میں انھوں نے ایک پری تمثال لڑکی سے درپردہ عشق کیا تھا یا نہیں' جدید تحقیق نے اس کے
بارے میں شکوک کو جنم دیا ہے۔ تاہم ان کی شاعری میں جذبہ' عشق کا خوب اظہار ملتا ہے۔ ان کے جذبہ' عشق کے کئی پہلو ہیں۔ وہ اس جذبے سے اپنے
وجود کو گداز کر چکے تھے۔ عشق نے ان کے تن بدن میں وہ آگ لگائی ہے کہ ان کے استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں۔

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

ان کے عشقیہ اشعار میں حسن نسوانی کی دلکشیوں' محبوب کے بدن کی خواہش' کیف وصال اور کرب انتظار کی کیفیات ملتی ہیں۔ انھوں نے دل کے
جانے کا ذکر کیا ہے اور اسے ''عجب سانحہ'' قرار دیا ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

ان کے یہاں عشق زندگی کا ایک اہم اور سنجیدہ تجربہ ہے۔ وہ اسے جنسی ابتذال کی پست سطح سے اٹھاتے ہیں اور روحانی رفعت اور فکری تب و تاب
میں بدل دیتے ہیں۔ جذبہ' عشق ان میں خارجی دنیا سے برگشتگی اور داخلیت پسندی کے رجحان کو تقویت دیتا ہے۔ عشق دنیا کی ساری زبانوں کی شاعری

میں ایک بنیادی تجربے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی مختلف صورتیں ابھرتی رہی ہیں۔ حافظ، غالب اور اقبال کے یہاں عشق علامتی اہمیت رکھتا ہے۔ عشق ان کے یہاں داخلیت، خود آ گہی، عرفان، تلاش اور جوشِ حیات کی علامت بن جاتا ہے۔ اردو اور فارسی میں ایسے عشقیہ اشعار بھی ملتے ہیں جو روایت اور تقلید کا پتہ دیتے ہیں۔ ولی کے بعد مظہر جانِ جاناں اور سودا، درد اور میر سوز کے یہاں عشق کے روایتی موضوعات کی کمی نہیں۔ خود میر کے دواوین میں بھی روایت غالب رہی ہے۔ تاہم میر کے چیدہ چیدہ اشعار میں عشقیہ تجربات کی تازگی اور سچائی کا پتہ ملتا ہے۔

ان کے یہاں عورت کا جو کردار ابھرتا ہے، وہ غیر انسانی نہیں۔ وہ خوب صورت عورت کی زندہ، شوخ اور طرح دار شخصیت ہے۔ اس سے میر کے یہاں حسیات کی بیداری کا پتہ چلتا ہے۔ حسیات کی تشفی جمالیاتی کیفیت کو جگاتی ہے۔

بال کھلے وہ شب کو شاید بسترِ ناز پر سوتا تھا
آئی نسیم جو صبح سے ایدھر پھیلا عنبر سارا ہے

......

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے
اس کی آنکھوں کی نیم خوابی سے

......

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

......

ساعدِ سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دیے
بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا

اس نوع کے عشقیہ اشعار میر کے جمالیاتی احساس کی نزاکت اور پاکیزگی کو ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ اسی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ زندگی کی بھیانک حقیقت کا اشاریہ بھی بن جاتے ہیں۔ محبوبہ عاشق کے دل پر مکمل تصرف پاتی ہے مگر خود ناقابلِ تسخیر رہتی ہے اور عاشق کو کرب، وحشت اور بے کسی سے آشنا کرتی ہے۔ یہ اشعار دیکھیے ان میں محبوبہ ایک ساحرہ ہے جو عاشق کو مبہوت کرتی ہے:

مبہوت ہوگیا ہے جہاں اک نظر کیے
جاتی نہیں ان آنکھوں کی جادوگری ہنوز

اس محبوب کی گلی میں عاشق کا جانا اس کی موت کا سبب بن جاتا ہے:

کیا بندھا ہے اس کے کوچے کا طلسم
پھر نہ آیا جو کوئی اودھر گیا

میر کی شاعری میں متصوفانہ خیالات و تجربات کا بھی نمایاں طور پر اظہار ملتا ہے۔ تصوف نے انھیں خالق و مخلوق کے رشتوں کا احساس دلایا۔ انھیں بچپن ہی سے صوفیانہ ماحول ملا تھا۔ ان کے والد اور منھ بولے چچا دونوں ان کو دنیوی خواہشات سے کنارہ کش ہوکر اپنے من میں ڈوبنے کی تعلیم دیتے رہے، چنانچہ خود آ گہی، قناعت اور استغراق ان کی طبیعت کا خاصہ بن گئے۔ وہ بعض فکری میلانات کا اظہار کرنے لگے اور زندگی، موت اور کائنات کے مسائل پر غور و فکر کرتے رہے۔

صوفی، سلوک کی مختلف منزلوں سے گزر کے فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ ازلی حقیقت کا حصہ بن جاتا ہے۔ حامدی کاشمیری میر پر اپنی کتاب ''کارگہہ شیشہ گری، میر کا مطالعہ'' میں لکھتے ہیں:

''میر بھی صوفی تھے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ صوفیانہ رنگ میں پوری طرح رنگے ہوئے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ میر درد کی طرح عملی اور ہمہ وقتی صوفی نہ تھے''۔ ان کے نزدیک دل نسخۂ تصوف ہے، جسے سمجھنے کی ضرورت ہے:

دل عجب نسخۂ تصوف ہے
ہم نہ سمجھے بڑا تاسف ہے

میر صوفی کے مانند اپنی شاعری میں تصوف کے مختلف پہلو ابھارتے ہیں:

عالم سیاہ خانہ ہے کس کا کہ روز و شب
یہ شور ہے کہ دیتی نہیں کچھ سنائی بات

......

یہ توہم کا کارخانہ ہے
یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

......

اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو ولیکن معدود جانتے ہیں

......

ہستی اپنی ہے بیچ میں پردہ
ہم نہ ہوویں تو پھر حجاب کہاں

انسان کو جیتے جی زندگی اور موت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میر کے خیال میں موت ایک ناگزیر، سفاک اور اٹل حقیقت ہے:

صد حرف زیرِ خاک تہہِ دل چلے گئے
مہلت نہ دی اجل نے ہمیں ایک بات کی

......

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

......

اے عدم میں جانے والو، تم تو چلو
ہم بھی اب کوئی دم میں آتے ہیں

اس میں شبہ نہیں کہ موت کی غارت گری ہر چیز کو بے معنی بناتی ہے اور وہ درد و غم کا پیکر بن جاتے ہیں۔ انھیں زندگی اور حسن کی بے ثباتی افسردہ کرتی ہے۔ زندگی کی بے ثباتی کے غم میں گھرے رہنے سے بعض نقاد انھیں قنوطی شاعر قرار دیتے ہیں۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''میر کے دل سے جب کوئی بات نکلی، وہ یاس و ناکامی میں ڈوبی ہوئی تھی۔'' (انتخابِ کلامِ میر)

مجنوں گورکھپوری کا خیال ہے کہ

''وہ یاس پرست تھے، ان کی شاعری پر قنوطیت چھائی ہوئی تھی''

میر کو قنوطی اور یاس پرست قرار دینا درست نہیں۔ سردار جعفری نے اپنی کتاب میں میر کو قنوطی قرار دینے سے انکار کیا۔ زیادہ سے زیادہ ان کی غم پسندی کو زندگی کے المیے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں نشاط و سرخوشی کے احساسات بھی ہیں۔

میر تقی میر غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں، ان کی استادی کا اعتراف غالب نے یوں کیا ہے:

ریختے کے تم ہی استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

انھوں نے میر کے دیوان کی تعریف یہ کہہ کر کی ہے کہ ان کا دیوان ''گلشن کشمیر'' سے کم نہیں ہے۔اسی طرح تذکرہ نویسوں نے بھی ان کی قادرالکلامی کا اعتراف کیا ہے:

قائم : فروغِ محفل سخن پردازاں، جامعِ آیاتِ سخن دانی

گردیزی: سخن سنجِ بے نظیر

میر حسن : شاعرِ دل پذیر

مصحفی : درفنِ شعرِ ریختہ مردِ صاحب کمال

شیفتہ : سخن ورِ عالی مقام

غالب ہی کی طرح دوسرے شعرانے بھی میر کے باکمال شاعر ہونے کی توثیق کی ہے۔

سودا : سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ — ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

ناسخ : شبہہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی کا — خود وہ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

حسرت : شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت — میر کا شوہ ٔ گفتار کہاں سے لاؤں

اس میں شک نہیں کہ میر کا ''شیوہ ٔ گفتار'' منفرد ہے۔مولوی عبدالحق نے لکھا ہے کہ ''ان کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہوگا کہ زبان کی سلاست و فصاحت کے ساتھ پیرایہ ٔ بیان کس قدر دل کش، نرالا اور پرتاثیر ہے''

اہم بات یہ ہے کہ ان کے اشعار ایک فطری بہاؤ رکھتے ہیں۔یہ شعوری آرائش، صنعت کاری اور تصنع سے پاک ہیں۔ان کے یہاں شعری اظہار کسی ارادی منصوبہ بندی کا مرہون منت نہیں۔وہ بعض لکھنوی شعرا مثلاً ناسخ کی طرح شعر کو الفاظ سے بوجھل نہیں بناتے۔وہ آمد کے شاعر ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے باطن سے اشعار یوں برآمد ہوتے ہیں جیسے کسی پہاڑ کے دامن سے کوئی چشمہ پھوٹتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شعوری طور پر کسی موضوع یا مضمون مثلاً تاریخی حالات، ذاتی واردات، عشق یا تصوف کو ہاتھ نہیں لگاتے، وہ ان کو شعری عمل سے دور رکھتے ہیں اور شعری عمل کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔میر تخلیق کے لاشعوری عمل کو روا رکھتے ہیں، تخلیقی عمل میں وہ خارجی اور داخلی دنیا میں فرق نہیں کرتے، وہ شعور اور لاشعور کی حدوں کو پار کر جاتے ہیں اور شخصیت کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ان سے ان کا کلام ''طبعِ رواں'' کی صورت اختیار کرتا ہے:

تھی بحر کی سی لہر کہ آئی چلی گئی
پہنچی ہے اس سرے تئیں طبعِ رواں کی بات

......

دیکھو تو کس روانی سے کہتے ہیں شعر میر
دُر سے ہزار چند ہے ان کے سخن میں آب

میر نے جو زبان استعمال کی ہے، وہ روایتی نہیں بلکہ تازہ کار ہے۔یہ فارسی سے استفادے کو ظاہر تو کرتی ہے مگر اس سے مغلوب نہیں۔ان کی زبان ہندوستانی سرزمین کی بو باس رکھتی ہے۔یہ نرمی، سادگی اور مٹھاس رکھتی ہے۔ان کی شعری زبان آنے والے کئی شعرا کے لیے سرچشمہ ٔ فیض کا درجہ رکھتی ہے۔موجودہ دور میں عظمت اللہ خان، حفیظ جالندھری، میراجی، فراق اور ناصر کاظمی خاص طور پر میر کی زبان سے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ناصر کاظمی، ابن انشا اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے تو باقاعدہ میر کے شعری آہنگ اور اسلوب کے احیا کی طرف دھیان دیا۔میر الفاظ کے پارکھ ہیں وہ فرسودہ فارسی الفاظ کے بجائے ایسے الفاظ برتتے ہیں جو اصلی اور فطری ہیں، انھوں نے خود کہا ہے:

شعر میرے ہیں سب خواص پسند
پر مجھے گفتگو عوام سے ہے

میر‘ عوام سے گفتگو کرنے کے باوجود خواص سے رابطہ رکھتے ہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کون سا لفظ کہاں استعمال کرنا ہے اور لفظ کس طرح شعری تجربے کی پہلوداری پر حاوی ہو جاتا ہے۔ یہ نادیدہ امکانات کو بروئے کار لانے کا عمل ہے۔ میر کا کمال یہ ہے کہ وہ سادہ الفاظ کو پیکروں میں ڈھالتے ہیں اور قاری حسیاتی پیکروں سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ انھوں نے فارسی تراکیب سے بھی خاصا کام لیا ہے لیکن ایسا کرتے ہوئے بھی ان کو سادہ بیانی میں ضم کرتے ہیں‘ چند فارسی تراکیب یہ ہیں:

ہنگامہ گرم کن‘ دل ناصبور‘ شورِ نشور‘ چمن زادِ طیر‘ جگر چاکی اور سوختہ جاں وغیرہ

چوں کہ میر شعر گوئی کے لیے زبان کو ایک نئے قالب میں ڈھالنے کی اہمیت سے واقف ہیں اس لیے وہ نئی ترکیبیں بھی وضع کرتے ہیں مثلاً قیامت شریر‘ دنیا دنیا تہمت‘ صحرا صحرا وحشت‘ غبارِ دل‘ ریگِ رواں‘ شورِ بہاراں‘ غزالانِ شہری وغیرہ۔

میر کا فن کارانہ شعور پختہ ہے وہ اشعار میں ابہام کو راہ دیتے ہیں‘ شاعری برہنہ گوئی نہیں‘ بقول علامہ اقبال:

برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی ست

میر ’’کمال گویائی‘‘ رکھتے ہیں‘ وہ عام فہم الفاظ کو بھی تخلیقی طور پر استعمال کرتے ہیں اور شعر کا تجربہ حجابات میں مستور رہتا ہے۔ قاری شعر کی روح تک پہنچنے کے لیے ابہام کے پردوں کو اٹھاتے ہیں اور تہہ در تہہ معانی سے فیض اٹھاتے ہیں: مثلاً

کن نیندوں اب تو سوتی ہے اے چشم گریہ ناک
مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا

......

لگی ہیں ہزاروں ہی آنکھیں اُدھر
اک آشوب ہے اس کے گھر کی طرف

......

صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی
کیا پتنگے نے التماس کیا

شعر کی مبہم پہلوداری میر کے اشعار کو علامتی بناتی ہے۔ اس سے شعر روایتی معنی کا پابند نہیں رہتا بلکہ مختلف معانی رکھتا ہے۔ میر نے خود کہا ہے:

میر صاحب کا ہر سخن ہے رمز
بے حقیقت ہے شیخ کیا جانے

میر کے علامتی اشعار وقت‘ عمر‘ عصر‘ آشوب‘ آگہی‘ جدائی اور اجاڑپن کے معانی کا اشاریہ ہیں۔

بہ ہر حال‘ میر کا شعری اسلوب منفرد اور جداگانہ ہے۔ کہتے ہیں:

نہیں ملتا سخن اپنا کسو سے

یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز دور سے پہچانی جاتی ہے۔ یہ ایک شعری کردار کی آواز ہے جو حساس‘ دردمند اور مخلص شخصیت رکھتی ہے۔ یہ آواز پرسوز اور مدھم ہے‘ یہ لہجے کے اتار چڑھاؤ‘ آہنگ‘ سرگوشی کا تخاطب اور بحریں طویل ہوں یا مختصر‘ مترنم ردیف و قافیہ کے ساتھ خاص دل کشی رکھتی ہے:

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا؟ اس بیماریِ دل نے آخر کام تمام کیا

......

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

......

چشم ہو تو آئینہ خانہ ہے دہر
منھ نظر آتے ہیں دیواروں کے بیچ